

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

کسی قوم کی اس سے بڑی بد نصیبی اور بیاہوسکتی ہے کہ وہ ان گنت قیمتی جانوں کو قربان کرے، اربوں روپے کی جائیداد لٹا کر، لاکھوں بہو بیٹیوں کی عزت و ناموس کا خون کر کے اور کروڑوں بھائیوں کو سبوتاہ سامراج کے چنگل میں دے کر اسلام کے لیے تجریہ گاہ کے طور پر ایک ملک حاصل کرے، مگر وہ ملک بد قسمتی سے معرض وجود میں آنے کے ساتھ ہی ایک ایسے گروہ کے تسلط میں چلا جائے جو اس خطہ ارضی میں اُس کی قومی اُمنگوں کو آٹھائے تعبیر کرنے کی بجائے اُن کا گلا گھونٹنے کے درپے ہو جائے اور اس طرح وہ پاک سرزمین جہاں اُس کے ارادوں کی تکمیل مقصود تھی وہ اس کے عزائم کا مدفن اور مرتدین جائے۔ ہم میں سے کون ابھی تک اس بات کو بھولا ہے کہ ہمارا ایک جداگانہ قومیت کا دعویٰ اور علحدہ مملکت کا مطالبہ کچھ اس وجہ سے نہ تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے ماسوا دیگر اقوام کے مقابلہ میں ہماری تعداد زیادہ تھی بلکہ ہمارے دعویٰ کی بنیاد صرف یہ تھی کہ متحدہ ہندوستان میں جو مخلوط حکومت قائم ہونے والی تھی وہ ان جماعتی تخیلات اور معاشرتی افکار سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتی تھی جن سے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا بیولائیاریا گیا ہے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ غیر مسلموں کے ہاں مذہب خدا اور بندوں کے درمیان محض ایک پرائیویٹ رشتہ ہے، اس لیے یہ لوگ اپنے ملکی اور سیاسی معاملات کو جس بیچ پر بھی چلانا چاہیں، مذہب اُن کے راستے میں کسی طرح حائل نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے ہاں معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ ہم اپنی مذہبی زندگی اور اجتماعی زندگی کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں کھینچ سکتے کیونکہ مذہب جہاں ہماری انفرادی زندگی کا رہنما ہے، وہاں وہ ہماری سیاسی اور معاشرتی زندگی کا مبداء اور اساس بھی ہے۔ ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن میں وہ صرف ایک عنصر کی حیثیت سے شامل نہیں ہوتا بلکہ وہی ان کا مدارِ اعلیٰ اور جوہرِ حیات ہے

اس لیے ہم مذہب کو اپنی اجتماعی زندگی سے خارج کر کے اپنی تہذیب کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ ان دوجہ کی بنا پر ہمارے لیے یہ بالکل ناممکن ہے کہ ہم سیاسی مملکتی اور تمدنی امور میں مذہبی انداز فکر سے ہٹ کر کسی دوسرے طریق فکر کو قبول کریں یا اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا کریں جو ہمارے مذہبی تصورات سے بالکل مغاثر ہو۔ یہ تخمیل بالکل معقولیت پر مبنی تھا اور ہمارے دین کے تقاضے کے عین مطابق۔ اسی لیے پوری مسلم قوم اس کے گرد جمع ہو گئی۔ جب یہ آواز بلند ہوئی تو ساری ملت نے اسے اپنے دل کی آواز سمجھتے ہوئے اس پر لبیک کہا اور اس کو ہر مراد کو حاصل کرنے کے لیے آگ اور خون کے سمندر میں کود پڑی اور اُس وقت تک چین نہ لیا جب تک کہ ایک علیحدہ اور آزاد مملکت حاصل نہ کر لی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہندوؤں اور کانگریس کے مقابلہ میں یہ دعویٰ پیش کرنے والے لوگ اس دعوے کے مقتضیات کو نہ صرف فراموش کر رہے ہیں، بلکہ اس بات کے لیے پوری طرح کوتاہاں ہیں کہ کسی طرح اس قوم کے دل و دماغ سے اس چیز کو نکال دیں کہ دین ہی اُن کی زندگی کی اصل بنیاد ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اپنے دعوے سے یہ انحراف پوری قوم کا انحراف ہے؟ کیا وہ قوم جو یہ نعرہ لے کر اٹھی تھی کہ ہمارا مذہب اور ہماری سیاست ایک ہے اور ہم اپنے مذہبی انداز فکر سے کسی شعبہ حیات کو بھی خالی نہیں رکھ سکتے، اُس نے تجربہ کے بعد اب یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اُن کا یہ نعرہ سراسر باطل تھا؟ آپ اس معاملہ پر جتنا غور کریں گے، آپ کو معلوم ہو گا کہ پوری قوم کا موقف آج بھی وہی ہے جو اُس وقت تھا۔ وہ واقعی دین کو اور اس کے اصولوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد سمجھتی ہے اور اس بات کے لیے آرزو مند ہے کہ اُس کی زندگی کے ہر شعبے اُس کے دین کی تحویل میں دے دیے جائیں۔ لیکن اُسے ہر اقتدار گر وہ کی غلط کاریوں نے سخت مایوس کر دیا ہے۔ یہ مایوسی بالکل فطری ہے۔ جب ایک قوم کو ڈروں انسانوں کے خون سے ایک کھیتی سیراب کرتے تاکہ اس میں اسلام کا نخل ہر ابھرا ہو، وہ جب یہ دیکھے کہ عین اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے خون سے سیلجی ہوئی کیاریوں میں غیر اسلامی افکار و نظریات کی چھاڑیاں اگانے کی فکر

کی جا رہی ہے تو اُس کے دل کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔ اتنا شدید کہ بسا اوقات پوری زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔

ان حالات میں اس قوم کی دستگیری کی تین صورتیں ہیں۔ اولاً یہ کہ اسے اس امر کی ضمانت دی جائے کہ جو ملک اُس نے اسلام کے لیے لیا تھا وہ اسلام اور صرف اسلام کے لیے ہی وقف رہے گا اور اس میں اگر کچھ لوگ قوت کے بل بوتے پر غیر اسلامی حرکات کا ارتکاب کر رہے ہیں تو یہ محض عارضی اور اتفاقی حادثات ہیں۔ دوسرے اس امر کی پوری کوشش کی جائے کہ اس ملت کو ان لوگوں کے چنگ سے نجات دلائی جائے اور ان کی جگہ اُن حضرات کو اقتدار کی باگیں سونپی جائیں، جو اقتدار کے اس راہوار کو منزل مقصود کی طرف پورے خلوص اور دیانتداری سے لے جائیں۔ اور تیسرے عوام کے اندر یہ احساس پیدا کیا جائے کہ جس دین کی خاطر انھوں نے بے پناہ قربانیاں دی ہیں وہ ان کے عملی تقاضوں کو بھی پورا کریں۔

یہ بات کسی محرم کی بنا پر نہیں بلکہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر کہی جاسکتی ہے کہ جماعت اسلامی ان تینوں مقاصد کے حصول کے لیے اول روز سے کوشاں رہی ہے۔ اُس نے عین اُس وقت جب یہاں کے صاحب اختیار لوگوں پر اقتدار کا نشہ بڑی طرح مسلط تھا اور وہ اس بدستی میں یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اس ملک کے اندر وہ جو چاہیں کریں، کوئی ان کو روکنے والا نہیں، ان لوگوں کی غلط کاریوں پر انہیں ٹوکا۔ اس کے کارکنوں نے اپنی جان و مال سے مکیسے پورا ہو کر یہ مطالبہ اٹھایا کہ سب سے پہلے اس ریاست کے مقصد کا تعین کیا جائے تاکہ لوگوں کو اس امر کا اطمینان ہو کہ جس سرزمین کو انھوں نے اسلام کے لیے حاصل کیا ہے وہ بہر حال اسی ایک مقصد کے لیے استعمال کی جائیگی۔ اس مطالبہ سے جس طرح اقتدار برہم ہوا اور جس طریق سے اُس نے اُس کو دبانے کی کوشش کی، یہ داستان بڑی شرمناک ہے، لیکن محض فضلِ ایزدی سے اس آواز نے ایک زبردست تحریک کی صورت اختیار کر لی، یہاں تک کہ اقتدار بھی اس بات پر مجبور ہوا کہ وہ اس مطالبہ کے سامنے تسلیمِ خم کر دے۔ چنانچہ بڑے جبر واکراہ کے ساتھ اسے اس چیز کا اعلان کرنا پڑا کہ اس مملکت کا نصیب العین اسلام ہے، یہاں اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ لوگوں کی زندگیوں

کو دینِ حق کے سلپنچے میں ڈھالا جائے، یہاں حکومت کے ذرائع و وسائل اُن بھلائیوں کو فروغ دینے میں صرف کیے جائیں گے جنہیں اسلام ترقی دینا چاہتا ہے، اور یہاں اُن برائیوں کا قلع قمع کیا جائے گا، جنہیں اسلام دنیا سے مٹانا چاہتا ہے۔

ریاست کے نصب العین کے تعین کے بعد اس بات کی قوی امید تھی کہ یہاں کا برسرِ اقتدار طبقہ اگر کچھ بھی اخلاص اور غیرت رکھتا ہے تو وہ یا تو اپنے نظریات و افکار کو ریاست کے مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر لیا یا پھر اقتدار کے تخت سے ہٹ جائے گا۔ لیکن افسوس اس طبقہ نے ایک ایسی بددیانتی اور بے غیرتی کا ثبوت دیا ہے جس کی کسی معقول انسان سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس نے نہ تو اپنے خیالات و احساسات بدلے نہ اختیار و اقتدار ہی کو چھوڑا، بلکہ قرار واد مقاصد کے اعلان کے بعد اس نے ایک طرف اس امر کی سرزور کوشش کی کہ کسی طرح قوم کے اندر اسلام کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلا کر اسے اس سے دور کیا جائے اور دوسری طرف اس نے اسلام پسند عناصر پر پیہم وار کیے تاکہ وہ یا تو ہمت ہار کر بیٹھ جائیں یا وہ پھر اس ماحول میں بالکل اجنبی بن کر رہ جائیں، قوم کے اندر نہ اُن کا کوئی اثر باقی رہے اور نہ ان کا کوئی وزن محسوس کیا جائے۔ لیکن یہ محض خداوند تعالیٰ کا احسان تھا کہ یہ لوگ خود ایسے مجاہدوں میں گرفتار ہوئے کہ مسلمانوں کو دین اور دین کے خادموں سے برگشتہ کرنے کی بجائے خود اپنے آپے برگشتہ کر بیٹھے لیکن افسوس یہ کہ ان کے اعمال سے نہ صرف ان کی اپنی رسوائی ہوئی ہے بلکہ بیرونی دنیا میں پاکستان کے وقار کو سخت زک پہنچی ہے۔ ملک کے اندر ان کا یہ حال ہے کہ لوگ انہیں وہ سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں جو انگریز یہاں سے جاتے وقت ان پر مسلط کر کے چلا گیا۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ اس حد تک مضطرب ہیں کہ ہر اس صدا پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں جو انہیں اس سے رہائی دلائے۔ مشرقی پاکستان میں پچھلے انتخابات میں برسرِ اقتدار گروہ کا جو حشر ہوا وہ اس حقیقت کی پوری طرح غمازی کر رہا ہے۔

ان حالات میں ایک خادمِ دین جماعت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ برگشتہ اور پریشان حال

عوام کی صحیح صحیح رہنمائی کرے، ان کو ایک فاسد قیادت کی جگہ ایک صالح قیادت ابھارنے کے لیے تیار کرے، اور انہیں اسلامی نظام عملہ پر پانے کا راستہ دکھائے۔ یہی مقصد ہے جس کے لیے جماعت اسلامی نے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔

پیشتر اس کے کہ ہم یہاں ان عزائم کا تذکرہ کریں جو جماعت اپنے سامنے انتخابات میں کامیاب ہونے کی صورت میں رکھتی ہے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو ایک باتیں اس کے اس فیصلہ کے بارے میں بھی کہہ دیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہمارا یہ فیصلہ کوئی نیا فیصلہ نہیں ہے جو یکایک ہم نے سیاسی طالع آزمائی کی طرح حالات کا رخ موافق دیکھ کر کر لیا ہو بلکہ ہمارا یہ فیصلہ اول روز سے ہی تھا۔ ہم اسی ارادہ اور غم کے ساتھ اٹھے ہیں کہ دنیا کی زمام کار فساد و فحار کے ہاتھوں سے نکال کر مومنین صالحین کے ہاتھ میں دے دیں۔ چنانچہ امیر جماعت نے ۱۹۶۵ء کے سالانہ اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے بڑے واضح و انگاف الفاظ میں کہا تھا:

”ہماری جدوجہد کا آخری مقصد انقلابِ امامت ہے، یعنی دنیا میں ہم جس انتہائی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فساد و فحار کی امامت و قیادت ختم ہو کر امامتِ صالحہ کا نظام قائم ہو اور اس سعی و جہد کو ہم رضائے الہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ دراصل فساد و فحار کی قیادت ہی نوع انسانی کے مصائب کی جڑ ہے اور انسانی بھلائی کا سارا انحصار صرف اس پر ہے کہ دنیا کی سربراہ کاری صالح لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔“

”انسانی معاملات کے بناؤ اور بگاڑ کا آخری فیصلہ جس مسئلے پر منحصر ہے وہ یہ سوال ہے کہ معاملات انسانی کی زمام کار کس کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح گاڑی ہمیشہ اس سمت میں چلا کرتی ہے جس میں ڈرائیور اس کو لے جانا چاہتا ہے اور وہ دوسرے لوگ جو گاڑی میں بیٹھے ہوں خواستہ و ناخواستہ اسی سمت میں جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں جدھر گاڑی جا رہی ہو، اسی طرح انسانی تمدن

کی گاڑی بھی اسی سمت پر سفر کرتی ہے جس سمت وہ لوگ جانا چاہتے ہیں جن کے ہاتھ میں تمدن کی باگیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمین کے سارے ذرائع جن کے قابو میں ہوں، قوت و اقتدار جن کے ہاتھ میں ہو، عام انسانوں کی زندگی جن کے دامن سے وابستہ ہو، خیالات و افکار اور نظریات کو بنانے اور ڈھالنے کے وسائل جن کے قبضے میں ہوں، انفرادی سیرتوں کی تعمیر و اجتماعی نظام کی تشکیل اور اخلاقی قدروں کی تعیین جن کے اختیار میں ہو، ان کی رہنمائی و فرمانروائی کے تحت رہتے ہوئے انسانیت بحیثیت مجموعی اُس راہ پر چلنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتی جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہوں یہ رہنا و فرماں روا اگر خدا پرست اور صالح لوگ ہوں تو اہل محالہ زندگی کا سارا نظام خدا پرستی اور خیر و صلاح پر چلے گا، برے لوگ بھی اچھے بننے پر مجبور ہوں گے، بھلائیوں کو نشوونما ہوگا اور برائیاں اگر مٹیں گی نہیں تو پریمان بھی نہ چرچہ سکیں گی۔ لیکن اگر رہنمائی و قیادت اور فرمانروائی کا یہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو خدا سے برگشتہ اور فسق و فجور میں سرگشتہ ہوں تو آپ سے آپ سارا نظام زندگی خدا سے بغاوت اور ظلم و بید اخلاقی پر چلے گا۔ خیالات و نظریات، علوم و آداب، سیاست و معیشت، تہذیب و معاشرت، اخلاق و معاملات، عدل و قانون، سب کے سب بحیثیت مجموعی بگڑ جائیں گے۔ برائیاں نشوونما پائیں گی اور بھلائیوں کو زمین اپنے اندر جگہ دینے سے اور پانی ان کو غذا دینے سے انکار کر دیں گے اور خدا کی زمین ظلم و جور سے لبریز ہو کر رہے گی۔ ایسے نظام میں برائی کی راہ چلنا آسان اور بھلائی کی راہ چلنا کیا معنی اس پر قائم رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔“

اقتباس ذرا طویل ہو گیا ہے لیکن اس کو درج کرنے سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہماری اس انتخابی پالیسی کو جو حضرات ہمارے مقصد اور نصب العین سے انحراف سمجھتے ہیں، وہ اسے غور سے پڑھیں اور دیکھیں، کیا انقلاب قیادت اول روز ہی سے ہمارا مقصد نہ تھا۔ زمام کار کی تبدیلی کوئی ایسی چیز نہیں جس کا ذکر کہیں کہیں مبہم الفاظ میں ہماری تحریر و تقریر میں موجود ہو بلکہ یہ وہ کام ہے

۱۔ تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں۔

جیسے ہم صراحت کے ساتھ شروع ہی سے بیان کرتے چلے آ رہے ہیں۔

اسی ضمن میں دوسری چیز، جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بسا اوقات ایک بہت بڑی غلط فہمی ہوجاتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہم کوئی اس دعوے کے ساتھ انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں کہ اس میں کامیاب ہوتے ہی ایک مثالی اسلامی ریاست معرض وجود میں آجائے گی۔ یا دوسرے لفظوں میں ہم کسی سحر کے زور سے آن کی آن میں اس بگڑی ہوئی سوسائٹی کو اسلامی معاشرے میں ڈھال دیں گے۔ اس قسم کے خیالات بعض لوگ ناسمجھی یا عدم واقفیت کی بنا پر ہماری طرف منسوب کرتے ہیں اور پھر ہمیں خود ہی سمجھانا شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھو جب تک لوگوں کے سیرت و کردار کو اسلام کے مطابق ڈھالنا نہ جائے اس وقت تک ایک صحیح اسلامی ریاست کا خواب محض حکایت تشنہ و سراب ہے۔ ہم اس قسم کے خیالات رکھنے والے لوگوں کی خدمت میں بعد احوال یہ عرض کریں گے کہ حضرات نہ ہمارا وہ موقف ہے جس پر آپ ہمیں کھڑا کر رہے ہیں اور نہ ہمارا وہ دعویٰ ہے جو ہماری طرف منسوب کیا جا رہا ہے۔ اس لیے آپ کو ہمارے مستقبل کے بارے میں جو خدشات نظر آ رہے ہیں وہ بے بنیاد ہیں۔ ہم سادہ اور واضح الفاظ میں جو کچھ کہتے ہیں وہ صرف یہ ہے: ریاست اور اس کے اسباب و وسائل لوگوں کے افکار و نظریات، اور سیرت و کردار کو کسی خاص سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک بہت بڑی قوت اور طاقت رکھتے ہیں۔ اس طاقت کو مخالف دین عناصر کے ہاتھ میں چھوڑنے کے بجائے ایسے ہاتھوں میں منتقل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو اسے اسلامی معاشرے کی تعمیر میں استعمال کر سکتے ہوں۔ یہ کوشش جتنی جتنی کامیاب ہوتی جائے گی، تعلیم، نشر و اشاعت، قانون، نظم و نسق، معاشی نظام، اور دوسرے تمام طاقتور مسائل کو اتنا ہی زیادہ نظام زندگی کی تبدیلی اور معاشرے کی تعمیر جدید میں استعمال کیا جاسکے گا، اور اس طرح اصل نصب العین تک پہنچنے کی راہ زیادہ سے زیادہ ہموار ہوتی جائے گی۔ یہ بات ہم بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ جب تک عوام صحیح معنوں میں مسلمان نہیں بنتے اسلامی حکومت کا قیام محض ایک خواب ہے۔ لیکن ہم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ خود عوام

کے مسلمان بننے ہی میں سب سے بڑی رکاوٹ غیر اسلامی حکومت ہے۔ اور ان کو مسلمان بنانے کے لیے ہی ان وسائل و ذرائع اور طاقتوں پر قبضہ ضروری ہے جن پر آج عصر حاضر کی سیکولر ریاست مسلط ہو چکی ہے۔ یہ نکتہ آخر کیوں لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔

ہمارے نزدیک یہ بھی بڑی غیر دانشمندانہ روش ہے کہ عوام کو ظلم و استبداد کے ہاتھوں نشانے مارے ہوں۔ اپنی بے شمار قربانیوں کو رائیگاں دیکھ دیکھ کر وہ سراپا نالہ و فریاد بنے ہوئے ہوں اور ہم محض تماشا ٹی بن کر یہاں زندگی گزارتے چلے جائیں۔ ہمارا دعوئے ہے کہ یہاں کے عوام میں اسلام کے لیے بڑی محبت و عقیدت ہے۔ وہ دین حق کے لیے آج بھی بڑی سے بڑی قربانی کر سکتے ہیں۔ وہ اگر بے عمل ہیں تو اس کے چند وجوہ ہیں۔ ہم اپنی قوم کو اس قدر نادان اور بیوقوف نہیں سمجھتے کہ وہ محض بدیشی آقاؤں کی جگہ ویسی آقاؤں کو اقتدار کی مسند پر متمکن کرنے کے لیے جان و مال اور عزت و آبرو کی اتنی عظیم قربانی دینے پر تیار ہو گئی تھی۔ ہم دیا ننداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں کا برسر اقتدار طبقہ اس مظلوم قوم کے ساتھ برا اثر مناک کھیل کھیتا رہا ہے۔ وہ اسے بھڑکایوں کا ایک بالکل بے زبان گلہ سمجھتا رہا ہے، جو صرف اُس کے فائدے کے لیے دنیا میں پیدا کیا گیا ہے۔ اور اس کے اس کھیل سے یہ قوم سخت بیزار ہو چکی ہے۔ اس حالت میں ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اپنی قوم کے لوگوں کو اس ذلت آمیز زندگی سے نجات دلوائیں، اُن کی گردن سے جو روح جفا کے قلا دوں کو اتاریں اور ایک ایسا ماحول تیار کریں جو ان کی توقعات اور آرزوئوں کی تعبیر ہو۔

ہو سکتا ہے کہ ہمارے خلاف پراپیگنڈا کا جو طوفان وقتاً فوقتاً اٹھایا جاتا ہے، اس کا اثر وہ ہونے میں ابھی کچھ دیر لگے، اور ہماری قوم ایک ہی مرحلے میں اس ظلم فریب سے آزاد نہ ہو جو برابر اقتدار لوگوں نے اس کے گرد باندھ رکھا ہے۔ لیکن ہمیں اس معاملہ میں پورا یقین ہے کہ ہماری قوم کی عظیم اکثریت اسلام کے معاملہ میں مخلص ہے۔ اس لیے جب بھی اسے اس بات کا شرح صدر حاصل ہو جائے گا کہ اسلام کی طرف واقعی یہ ایک مخلصانہ قدم ہے اُس وقت وہ پروانہ وار آگے بڑھے گی۔

پھر دنیا کا کوئی مکر و فریب اُسے اس راستہ سے ہٹا نہیں سکے گا۔

یہ ہیں وہ حالات اور توقعات جن کے ساتھ ہم انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں۔ ہمارے اس فیصلہ کا محرک نہ تو ہوس اقتدار ہے اور نہ جاہ و منصب کی خواہش۔ ہمارے اس فیصلہ کا محرک صرف فرض کی پکار ہے۔ اس پکار پر لبیک کہنے والوں کی طبیعت کا شروع ہی سے یہ خاصا رہا ہے کہ وہ ہمیشہ مادی اسباب و وسائل سے بے نیاز اور نتائج سے یکسر بے پروا ہوتے ہیں۔ جو انسان فرض کی بجا آوری میں آگے بڑھے، اسے بھلا اس بات کی کیا فکر ہو سکتی ہے کہ وہ کامیاب ہو یا ناکام۔ اُس کی کامیابی کا راز تو اسی میں مضمر ہے کہ اُس نے ایک صحیح نصب العین کے حصول کے لیے جدوجہد کی۔ باقی رہے نتائج تو ان کا معاملہ اسی ذات کے ہاتھ میں ہے جو ہم سب کی خالق مالک اور آقا ہے اور جس کے قبضہ و اختیار میں دنیا کے سارے وسائل ہیں۔ اُس کے فیصلے ہمارے لیے ہر حال میں صحیح اور درست ہیں اور ہم اس کی رضا پر ہر صورت میں قانع ہوں گے۔

ان ابتدائی گزارشات کے بعد آئیے ایک نظر اُس انتخابی عشور پر بھی ڈالیں جو جماعت کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس عشور کے معاملہ میں چند باتیں قابل غور ہیں۔

اس صدی میں غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ کسی اسلامی جماعت نے، جو اسلامی نظام پر پکارنے کا دعوہ رکھتی ہو، جدید ریاست کے تقاضوں کے پس منظر میں اسلام کے نفاذ کی ایک معین صورت سامنے رکھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں پچھلی صدی کے نصف کے بعد سے مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا شدت سے ابھر رہا ہے کہ اُن کی تباہی اور بربادی کا واحد سبب اسلام سے روگردانی ہے، اگر وہ دنیا میں باغزت طور پر رہنے اور آخرت میں نجات کے طالب ہیں، تو پھر اُن کے لیے اس کے سوا کوئی دوسری شکل ممکن نہیں کہ وہ اسلام کو اپنی زندگی کا رہنما اصول بنائیں۔ اس وجہ سے اب پچھلے چند سالوں سے جہاں ایک طرف اسلام سے مسلمانوں کا لگاؤ اور دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے وہاں دوسری

حرف ایک ایسا ٹریچر بھی معرفت کے ساتھ معرض وجود میں آ رہا ہے جو اسلام کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض کتابیں بڑی ہی عمدہ اور مفید سامنے آئی ہیں۔ لیکن اگر آپ سائے علمی سرمایہ کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس میں زیادہ زور نظریاتی امور کی تصریح پر دیا گیا ہے اور عہد حاضر کے جن عملی مقتضیات سے ایک مسلمان کو سابقہ پیش آتا ہے یا آسکتا ہے اس سے بہت کم بحث کی جاتی ہے۔ اس منشور میں ہر قاری اسلامی نظریات و افکار کی عملی تعبیر کا ایک ملکا سا نقش و نگار سکتا ہے۔

اسی سلسلہ کی دوسری چیز جس کی طرف ہم پچھلے صفحات میں اشارہ کر چکے ہیں، اور جس کو ہم اس کی اہمیت کے پیش نظر پھر دہراتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ منشور کسی مثالی اسلامی ریاست کا منشور نہیں ہے۔ ہمارے اپنے رفقاء اور ہمارے فاضل ناقدین اس کا جائزہ لیتے ہوئے اس بڑی حقیقت کو نظر انداز نہ کریں کہ یہ منشور ایک ایسے ملک میں پیش کیا جا رہا ہے جس کا سارا نظام اب تک عملاً سیکولر بنیادوں پر چلایا جاتا رہا ہے، اور اب اس جلتی ہوئی گاڑی کو اسلامی نظام کی طرف موڑنا ہمارے پیش نظر ہے۔ لہذا اس منشور کو اس نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ ایک سراسر غیر اسلامی ماحول میں اسلامی نظام کا آغاز کس طرح کیا جائے گا۔ جو ملک دو سو سال سے غیر ملکی سامراج کا غلام چلا آ رہا تھا، جہاں مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کے سارے آثار کو ایک لگے بندھے منصوبہ کے تحت مٹانے کی کوششیں کی گئی ہیں، جہاں مسلمانوں کے رگ و پے میں غیر اسلامی افکار و تصورات اتارے گئے ہیں، جہاں پورے نظام حیات کو کافرانہ طریقوں پر قائم کر دیا گیا ہے، وہاں اگر تبدیلی کے مواقع خداوند تعالیٰ عطا کر دے تو ہم اس بہتے ہوئے دھارے کے رخ کو بدلنے کے لیے کیا کچھ اقدام کریں گے۔ اس لیے یہ اسلامی ریاست کا آخری نقشہ نہیں بلکہ بالکل ابتدائی خاکہ ہے۔ یہ اس نصیب العین کی طرف صرف پہلا قدم ہے۔ چنانچہ اس کو آئیڈیل اور حکمت عملی کے درمیان صحیح توازن کے تحت تشکیل دیا گیا ہے۔

اس منشور کا تیسرا اہم پہلو اس کی ہمہ گیری ہے۔ ہم اس بات کا پورا یقین رکھتے ہیں کہ صحیح اسلامی نظام صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جبکہ انقلاب ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہو۔ چند سطحی اور اوپری تبدیلیاں کر لینے سے اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر اس منشور میں حیات انسانی کے سارے شعبوں پر خواہ ان کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہو یا انفرادی زندگی سے۔ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس میں اگر ایک طرف خارجہ پالیسی کو حق و انصاف پر، معیشت کو عدل و مساوات پر، سیاست کو دیانت و امانت پر استوار کرنے کے غم کا اظہار ہے تو دوسری طرف انفرادی زندگی کے لیے بھی تعلیم و تربیت کا ایک عمدہ پروگرام موجود ہے جس سے مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلامی تعلیمات کے بارے میں سلجھاؤ، طبائع میں سلامت، مزاج میں اعتدال، سیرت میں مضبوطی اور امتلاق میں پاکیزگی پیدا ہو۔ ہم اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ کوئی اسلامی نظام اس وقت تک صحیح معنوں میں قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی پشت پر خدا ترس انسانوں کی ایک منظم طاقت موجود نہ ہو۔

منشور کی اس ہمہ گیری کو دیکھ کر ممکن ہے بعض انسانوں میں یہ احساس پیدا ہو کہ اصلاح و ترقی کا یہ پروگرام بڑا بوجھل ہے۔ اس معاملے میں ان کے خدشات کو بالکل غلط نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اس ضمن میں ہماری گزارش یہ ہے ہم نے یہ چیز اسلام کے منشاء کے عین مطابق کی ہے۔ اسلام نے حیات انسانی کے مختلف شعبوں کو باہم ایک دوسرے سے اس طرح مربوط کیا ہے کہ اگر ہم ان کو الگ الگ کرنے کی غلطی کر بیٹھے تو ہم ساری تعلیمات الہی کا حلیہ بگاڑنے کے قریب پہنچے۔ اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہم اسلامی نظام کی طرف اگرچہ پیش قدمی تو نہایت آہستہ آہستہ کریں مگر اس میں سارے شعبے ایک دوسرے کے ہم عشاں اور ہم کاب ہوں۔

آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ اس منشور میں تبدیلیوں کی نوعیت کیا ہے:

سب سے پہلی تبدیلی مملکت کے مقصد کی تبدیلی ہے۔ اس منشور میں یہ چیز بجاہت موجود ہے کہ مملکت

مقصود بالذات نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا انسانی ادارہ ہے جو انسانوں کی خدمت کے لیے وجود میں آیا ہے اور جس کی غایت نہ صرف ملک کو اندرونی خلفشار اور بیرونی خطرات سے بچانا ہے بلکہ ان بھلائیوں کو فروغ دینا بھی ہے جنہیں اسلام دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے اور ان برائیوں کو مٹانا ہے جنہیں اسلام اس دنیا سے ناپید کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے یہ مملکت محض اعتباری اور مجازی طور پر مقتدر ہے۔ اس میں کوئی الوہیت کی شان نہیں پائی جاتی۔

اس مملکت میں امر و اقتدار سوائے خدا کے کسی کو حاصل نہیں جو ازلی وابدی اور واجب الذات ہے۔ انسانوں کو اگر اقتدار حاصل ہوا ہے تو یہ محض وہ امانت ہے جو انہیں تفویض کی گئی ہے۔ اس بنا پر بربر اقتدار گمراہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جتان پھرے بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ اسلامی اخلاقیات کے مشہور اصول "سید القوم خاد مہم" کے مطابق ملک کے انتظام کو چلائے۔ مملکتی قانون اس وقت تک قابل احترام ہے جب تک کہ وہ حق کے موافق ہے۔ حق قانون سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ قانون حق پر مبنی ہونا چاہیے جو اللہ تعالیٰ کی عین مرئی ہے۔

اسلامی نظام کو برپا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری سمجھا گیا ہے کہ ہم غیر ملکی تسلط سے یکسر آزاد ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس مقصد کے حصول کے لیے صرف ایک غیر جانبدارانہ روش اختیار کر لینا ہمارے مسئلہ کا حل ہے۔ ہمارے نزدیک یہ طرز عمل ہماری مشکلات کا حل نہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آج کل کے بین الاقوامی حالات میں ہمارے لیے اس پالیسی پر قائم رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب محال ہے۔ دوسرے شاہد علی الناس کی حیثیت سے ہماری امت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم دنیا کے ہر مسئلہ میں حق کی شہادت دیں۔ مسلمان رہتے ہوئے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے جبر و استبداد ظلم اور زیادتی دیکھیں مگر کسی مصلحت پرستی کے تحت جو روحیہ پرچہ سادہ رکھیں۔ یہ فرض پرستانہ شان بے نیازی ایک ایسی قوم تو اختیار کر سکتی ہے جسے حق سے زیادہ دنیاوی مال و متاع عزیز ہو لیکن یہ طرز عمل اس قوم کو قریب نہیں دیتا جو پوری دنیا میں عدل و انصاف کی حکمرانی اور فرما تو ملتی قائم کرنے کے لیے اٹھی ہو۔ ہم اپنے ایمان کے تقاضوں سے مجرمانہ غفلت کے مرتکب ہونگے اگر ہم کسی دنیاوی لاپرواہی کے تحت عافیت اور غیر جانبداری کے

ساحلی پر کھڑے ہو کر بین الاقوامی سیاست کے اٹھارہ سمندر میں استعمار پسندوں کی سفایکوں اور زیر دست آزاریوں کو خاموشی سے دیکھتے رہیں اور مظلوموں کو بچانے کے لیے کوئی عملی قدم نہ اٹھائیں۔ چنانچہ اس منشور میں ہم نے بڑے واضح الفاظ میں اس عزم کا اظہار بھی کیا ہے کہ اگر ہم پر بھاری قوم نے اعتماد کرتے ہوئے ہمیں ملک کی عنان اقتدار سے دی تو ہم سامراجیت کے خلاف — وہ سفید ہو یا سرخ، ایشیائی ہو یا مغربی — صف آرا ہوں گے اور ہر ممکن طریق سے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کریں گے اور ان اقوام کی حمایت کریں گے جن پر استعمار کے دیوانہوں نے صدیوں سے عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔

جہاں تک دستور اور قانونی اصلاحات کا تعلق ہے ہم یہ چاہتے ہیں کہ موجودہ دستور میں اسلام سے نکلنے کے بغیر چھدر دازے رکھے گئے ہیں انہیں بالکل بند کر دیا جائے۔ بدقسمتی سے اس ملک میں ابھی تک ایک شرارت پسند گروہ اس گھات میں بیٹھا ہے کہ کسی طرح دستور میں اسلام کے متعلق جو دفعات ہیں ان کو نکال دیا جائے یا اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو تو پھر ان کی کوئی ایسی تعبیر کر دی جائے جو ان کے ملیانہ نظر بابت سے ہم آہنگ ہو۔ اسی سلسلہ کی ایک چیز خدا کی حاکمیت ہے۔ اس دستور میں اگرچہ یہ تو طے کر دیا گیا ہے کہ حاکمیت اللہ کی ہے لیکن یہ فتنہ جو اب اس سے استمدال کر رہے ہیں کہ چونکہ اس حکومت کو انسان ہی چلائیں گے اس لیے حکومت در حقیقت انسانوں ہی کی ہوگی اور وہ جس طرز پر بھی حکومت چلائیں، وہ خدا ہی کی حکومت کہلائے گی۔ ہمارے نزدیک خدائی حکومت کی یہ تشریح نہ صرف غلط بلکہ بڑی گمراہ کن ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اگر ہمیں اللہ تعالیٰ نے موقع دیا تو ہم موجودہ دستور میں ختنے رخنے ہیں انہیں بند کر دیں گے تاکہ کوئی فتنہ ساز نہ تو اس کی من مانی تاویل کر سکے اور نہ اہل غرض اس کو ہر قسم کے معنی پہناسکیں۔ اس ضمن میں پہلی تبدیلی ہم یہ چاہتے ہیں کہ دستور میں اس امر کی بالکل غیر مبہم الفاظ میں وضاحت کر دی جائے کہ قرآن و سنت دونوں ملکی قانون کے اولین ماخذ ہوں گے۔ اللہ کی حاکمیت ہماری عملی زندگی میں اس وقت تک مؤثر نہیں ہو سکتی جب تک اس کی تکوینی حاکمیت کے ساتھ اس کی تشریحی حاکمیت کو بھی تسلیم نہ کیا جائے اور خدا کی تشریحی حاکمیت کے آخری مظہر چونکہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لیے ضروری ہے کہ حضور ہی کو زندگی کے ہر شعبے میں واجب الاطاعت ہادی مانا جائے۔

ہم اس چیز کا بھی غم بالآخر رکھتے ہیں کہ اُس عظیم فتنہ کے بارے میں، جس نے پچھلے پچاس ساٹھ سالوں میں مسلمانین ہند و پاک کی وحدت کو شدید نقصان پہنچایا ہے، ایک قطعی اور حتمی فیصلہ کر دیا جائے۔ اسلامی ریاست کا قیام کسی دوسری اصولی ریاست کے قیام کی طرح، ایک ایسی منظم سوسائٹی کے وجود کا متقاضی ہے، جس کے افراد نہ صرف چند مشترک اقدار کے علمبردار ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے متحد ہوں بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سوسائٹی بعض اصولوں کی بنا پر دوسرے معاشروں سے ممتاز بھی ہو۔ اسلام نے نسل، زبان اور رنگ کی ہم آہنگی سے قوم کے مختلف افراد میں وحدت و اتحاد پیدا کرنے میں مدد نہیں لی، بلکہ اس کے برعکس ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت سے یہ کام لیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس نے اس امت کو دوسری امتوں سے الگ کرنے کے لیے بھی وطنیت کی دیواریں چھیننے کی بجائے نبوت کی حد بندی کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ توحید اور رسالت ہی نے مسلمانوں کے مختلف اجزا کو جوڑا ہے۔ انہیں سے ہمیں ایک ایسی قوتِ رابطہ و ضابطہ مہیا آئی ہے جس نے اجسام کے تعدد اور نفوس کی کثرت کے باوجود ہمیں ایک جگہ جمع کر دیا ہے مگر جس جذبہ نے ہمیں دوسری قوموں سے الگ ہونے کا شعور بخشتا ہے ہمیں ایک علیحدہ امت کی تشکیل پر ابھارا ہے، ہمارے اندر یہ احساس پیدا کیا ہے کہ ہم اپنا ایک مستقل وجود رکھتے ہیں، وہ عقیدہ ختم نبوت ہی ہے۔ ہماری یہ وہ سرحد ہے جس کی حفاظت اور پاس پائی جاوے سب سے اہم فرض ہے۔ اس معاملے میں کسی غفلت کو ہم اپنے قومی بقا کے لیے بے حد ہلکا اور خطرناک سمجھتے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ جس فتنہ کو انگریزوں نے ہماری ملی سرحدوں پر اپنے مخصوص مصلح کے تحت لاکھڑا کیا تھا، اُس کے تدارک کی فکر کریں اور اس سے فتنے کی ہمارے نزدیک سب سے بہترین صورت یہی ہے کہ مرزا غلام احمد کے ماننے والوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

قانونی اصلاحات کے دائرہ میں ہم یہ بھی ارادہ رکھتے ہیں کہ مغربی سامراج نے اپنے استعمار کو قائم رکھنے کے لیے باشندگان ملک کی جن ناجائز اور ظالمانہ قوانین کے ہمارے آزادیاں سلب کر رکھی تھیں، انہیں منسوخ کر دیا جائے۔

اسلامی نظام کے قیام کے لیے یہ چیز بھی اشد ضروری ہے کہ اس ملک میں معاشی استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے مسائل راستوں کو سدود کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ہماری پہلی کوشش ملک کے زرعی نظام کی اصلاح ہے۔

انگریزوں نے اپنے استعمار کے پنجے کو باشندگان ملک کے جسموں میں مضبوطی سے پیوست کرنے کے لیے اس جاگیردارانہ نظام کو جنم دیا، جو آکاس ہلی کی طرح بیماری زراعت پر چھایا ہوا ہے اور اسے بالکل پروان نہیں بڑھنے دیتا۔ اس مسئلہ کا حل ہمارے لیے بڑا ہی اہم ہے لیکن ہم اس معاملہ کو محض جذباتیت یا خوش کن نعروں سے حل نہیں کرنا چاہتے اس کے حل کی ہمارے نزدیک یہی ایک صورت اصولاً صحیح اور فی الحال قابل عمل ہے کہ تمام ایسی زمینداروں کے منتقل جو دو سو ایکڑ نہری و چاہی یا ہم سو ایکڑ بارانی سے زیادہ رقبے کی ملکیت پر مشتمل ہوں تحقیقات کی جائے اور ان میں سے جو شریعت اسلامیہ کی رو سے ناجائز ہوں، ان کا ایک معقول حصہ ان کے مالکوں کو بطور کفالت دیکر باقی سب زمینوں کو بلا صلہ ضبط کر لیا جائے اور پھر انہیں ان مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے جو فی الحال ان میں کاشت کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جو زمینداریاں جائز ملکیت قرار پائیں انہیں بھی ایسے قوانین کا پابند بنایا جائے جن سے سماج کے سارے طبقوں میں عدل و انصاف قائم ہو اور کوئی گروہ دوسرے پر ظلم و ستم نہ کر سکے۔

ہم ملک کی صنعتی قوتوں کو بلاتماخیر ریمان چڑھانے کے متمنی ہیں۔ لیکن ہم یہ کسی صورت نہیں چاہتے کہ ایک مختصر سا طبقہ ناجائز مراعات لیکر اور غریب محنت کاروں کا خون چوس کر دوا و عیش دنیا شروع کر دے ہم اس بات کی انشاء اللہ پوری کوشش کریں گے کہ صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ بندہ مزدور کے تلخ اوقات بھی بہتر ہوں۔ اُسے نہ صرف دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہو، بلکہ اُسے اور اُس کے اہل و عیال کو بچھنے کے لیے مکان اور بیماری کی صورت میں علاج معالجہ کی سہولتیں بھی ہم پہنچیں۔ اُس کی حیثیت بچے کی مشینوں کے مقابلے میں صرف مٹی کی ایک ادنیٰ اسی مشین کی نہ ہو بلکہ اُس کے ساتھ ایک انسان کا سا سلوک کیا جائے اور کسی کارخانہ میں اپنی جوانی کھپا دینے کے بعد وہ اس بات کا حق رکھتا ہو کہ کارخانہ کے مالک سے اپنے بڑھاپے کے دن گزارنے کے لیے بھی ایک معقول رقم کا مطالبہ کر سکے۔ اصلاح کا کوئی پروگرام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا جب تک لوگوں کے فکر و نظر کے زاویوں کو تبدیل کرنے کا انتظام نہ کر لیا جائے اس لیے ہم اپنے تعلیمی نظام میں بھی کافی رد و بدل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ چیز ٹری ہاتھوں سے کہ تعلیم کے دروازے صرف دو تمدن طبقوں پر ہی کھلے ہوں اور غریبوں کو اس سحر و جادو کو دیا جائے اس نظریہ کو ہم کبیر باطل سمجھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تعلیمی سہولتوں کو اس قدر عام کر دیا جائے کہ تعلیم کسی شہری کی دسترس سے باہر نہ رہے۔ ہم دینی تعلیم اور دنیاوی تعلیم کی تقسیم کو بھی غلط سمجھتے ہیں اور انشاء اللہ اس امر کی پوری کوشش کریں گے کہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں نظام تعلیم کی اس طرح سے اصلاح ہو کہ یونیورسٹیاں اور سنی مدارس مل کر ایک ہی نظام تعلیم میں مدغم